عہدِ نبوت کے عمرانی اور تمدنی مسائل

(حکیم حمید زمان صاحب صدیقی)

(قسط دوم)

نظامِ تمدن کی ہیبت ناکیاں انسانی تمدن و اجتماع اگر کسی پاکیزہ اور بلند اخلاقی تصور پر مبنی نہ ہو تو اس کا لازمی نتیجہ بہیمانہ طبقاتی نزاع، خود غرضانہ گروہ بندی، ملت کش مفاد پرستی، ظالمانہ سیاست اور معاشی نامساوات کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اس بات کو کوئی مانے یا نہ مانے لیکن حقیقت یہی ہے کہ ایسا پاکیزہ نصب العین دینِ حق کے سوا کسی دوسری جگہ سے دستیاب نہیں ہوتا اور جہاں دین کی روح کا فقدان ہو وہاں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ انسان اپنے مقصدِ وجود اور حقیقی نصب العین کو جان سکے۔ لیکن سطور بالا میں عرض کیا جا چکا ہے کہ سرورِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا کی تمام قومیں دین کی حقیقی روح سے محروم اور لذتِ حق پرستی سے ناآشنا تھیں اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی سیاست معیشت اور عمران و تمدن کا پورا انتظام انتشار و فساد کی نذر ہو گیا تھا ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (الآیہ)

انسانی تاریخ کا یہ دور غیر الٰہی حاکمیت کے جبر و استبداد، سرمایہ پرستانہ ذہنیت کی سفاکی، ظالمانہ اور فاسقانہ معاشرت اور ہمہ گیر فسادِ انسانیت کا ایک ایسا ہیجانی دور تھا جس کی مثال ماضی کی پوری تاریخ میں مشکل ہی مل سکتی ہے۔ بادشاہوں کی قبائیں فاقہ کش اور مفلوک الحال عوام کے خونِ ناحق سے رنگین تھیں اور ان کے تخت زرنگار ہزاروں انسانوں کی لاشوں پر بچھائے گئے تھے۔ امراء و حکام [illegible] کا خون چوس رہے تھے۔ ہر طرف ظلم و معصیت کا طوفان بپا تھا۔ قلب و نظر کی صلاحیتیں مسخ ہو چکی تھیں، نیکی کو برائی اور برائی کو نیکی تصور کیا جانے لگا تھا۔ انسانی طبائع شر و فساد سے مانوس ہو چکی تھیں اور اخلاق و شرافت کے لئے دنیا کے کسی گوشہ میں پناہ گاہ نہ رہی تھی اور حالت یہ کہ چند گنے چنے انسانوں کو چھوڑ

کہ کسی انسانی دل میں حق کی طلب و جستجو کی خواہش ہی باقی نہ رہی تھی۔

مشرق خراب مغرب ازاں بیشتر خراب عالم تمام مردہ و بے ذوق جستجو

یہ حالات تھے جن میں خالق کائنات نے اپنے آخری نبی حضرت احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ کے ذریعہ اس ظلمت کدۂ عالم کو نور ہدایت سے روشن کیا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی اقوام کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مفاسد کا سرسری جائزہ لیا جائے تاکہ اس سے اندازہ ہو سکے کہ آنحضرت صلعم کے زمانۂ بعثت میں اجتماعی اور تمدنی مسائل کی نوعیت کیا تھی اور آپ کو کن کن عملی مسائل سے سابقہ پڑا؟ اس کے بعد ہم کسی ایک نتیجہ پر پہنچ سکیں گے کہ عصر حاضر کے انسانی مسائل وہی ہیں جو اس دور میں تھے یا ان سے مغائر ہیں؟

زہرناک قومی تعصب اور بے قید سیاست بعثت نبوی کے وقت دنیا کی تمام چھوٹی بڑی قوموں کا اجتماعی کردار پستی کی انتہائی حد کو پہنچ گیا تھا۔ ان کی سیاست بے اصولے پن، نسل کشی، قومی عصبیت، تخریب پسندی، سفاکانہ حملہ و ہجوم اور بے دردانہ قتل و غارت کے لئے وقف تھی اور ان کے معاشی منصوبوں کا انحصار آوارہ گردی، غارت گری اور لوٹ مار کی متنوع اسکیموں پر تھا اور ان کی معاشرت ظالمانہ اور انسانیت کش قوانین پر مبنی تھی چنانچہ اس دور کی متمدن قوموں، روم و ایران اور ہند و چین کے حالات کا اگر جائزہ لیا جائے تو حیرانی ہوتی ہے کہ اگر تہذیب و تمدن اسی کا نام ہے تو پھر وحشت و بہیمیت کے لئے کونسا نام تجویز کیا جائے؟

روما کی حکومت اس وقت دو بازوؤں میں تقسیم ہو چکی تھی "مغربی بازو" اور "مشرقی بازو"۔ "مغربی بازو" اخلاقی طور پر تسفل و انحطاط کے انتہائی نقطہ پر پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ مشہور مسیحی مؤرخ گبن لکھتا ہے "اگر اس وقت روم کے تمام بیرونی وحشی مخالفین فنا بھی ہو جاتے تو ان کی تباہی سلطنت کے مغربی بازو کو زوال و تباہی سے نہیں بچا سکتی تھی۔

نیز مؤرخ مذکور لکھتا ہے ـــــ "رومن حکومت مخالفین کی نظر میں روز بروز زیادہ کمزور اور خود اپنی رعایا کی نظر میں زیادہ ظالم اور ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی، کفایت شعاری جتنی ضروری ہوتی جا رہی تھی۔

اسی قدر اس کی جانب سے بے اعتنائی بڑھتی جاتی تھی اور جس نسبت سے رعایا کے مصائب روز افزوں تھے اسی نسبت سے ٹیکسوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔[1]

اس سیاسی بدنظمی اور اخلاقی پستی کا نتیجہ تھا کہ جرمنی کی وحشی اقوام نے مغربی بازو کو کچل کر رکھ دیا اور گو ان حملہ آور جرمنوں نے عیسائیت قبول کر لی مگر قبول مذہب ان کے سفاکانہ اور وحشیانہ مظالم میں کوئی کمی نہ کر سکا۔

سلطنت روما کے مشرقی بازو کی حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھی۔ چونکہ اس کی سرحدیں مملکت ایران سے ملتی تھیں اس لئے یہ ہمیشہ اہل ایران سے الجھا رہا اور پے در پے جنگوں نے اس کو بالکل نچوڑ دیا تھا۔ عہد نبوی کے آغاز میں ایرانیوں نے اہل روم کو عبرتناک شکست دی تھی اور ان کے اہم صوبوں مصر و شام و فلسطین پر قبضہ کر لیا تھا اور ۶ھ یعنی صلح حدیبیہ کے زمانہ میں رومیوں نے اہل ایران کو ایسی شکست دی کہ وہ پھر کبھی نہ سنبھل سکے لیکن بیزنطینیوں کے داخلی مفاسد نے ان کو اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ اس فتح عظیم سے فائدہ اٹھاتے۔

رومیوں اور ایرانیوں کی خونریز لڑائیوں میں جو چیز سب سے زیادہ افسوسناک تھی وہ یہ ہے کہ ان کی قومی عصبیت اور مذہبی جنون اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ انسانیت و شرافت کی کوئی قدر ان کی نظر میں مستحق احترام نہ رہی تھی اور مذہب و اخلاق کی پامالی کا خوفناک سے خوفناک منظر بھی ان کے دلوں کو پسیجنے کے لئے کافی نہ تھا۔ چنانچہ خسرو پرویز نے جب فلسطین پر حملہ کیا تو اس نے پہلا کام یہ کیا کہ عیسائیوں کی عبادت گاہوں کو نذر آتش کر دیا اور بے دردی سے ہزارہا عیسائیوں کو تہ تیغ کیا۔ اور جو بچے کھچے تھے ان کو گرفتار کر لیا۔ اسی طرح رومی سلطنت کے حکمران ہرقل نے جب شمال کی طرف سے ایران پر حملہ کیا تو اس نے بھی جوابی طور پر مجوسیوں کے آتشکدوں کو برباد کیا اور لاکھوں انسانوں کا خون بہایا۔

یہ کوئی اتفاقی واقعات نہ تھے بلکہ یہ وحشت و بہیمیت اس دور کی اقوام کے قومی کردار کا

---

[1] تاریخ زوال و انحطاط روما جلد دوم

جزولاینفک بن گئی تھی اور اس سے پہلے بھی بارہا اس قسم کے واقعات منظر عام پر آچکے تھے۔ چنانچہ رسول عربی صلعم کی ولادت سے ایک سو سال پہلے کا ایک واقعہ جس کو اسلامی مورخین نے قلمبند کیا ہے یہ ہے کہ یمن کے ذونواس نامی یہودی بادشاہ نے نجران کے عیسائیوں کو جبری حکم دیا تھا کہ وہ عیسائیت چھوڑ کر یہودی بن جائیں اور اہل نجران کے انکار پر اس نے نجرانی عیسائیوں کو آگ کے دہکتے ہوئے شعلوں میں دھکیل دیا تھا[1]۔ نجران کے کچھ لوگ جو اس آزمائش سے بچ نکلے تھے، حبشہ کے نجاشی کے پاس پہنچے اور داستان ظلم پوری کی پوری سنائی۔ نیز انجیل کے جلے ہوئے اوراق بھی دکھائے اور نجاشی سے انتقام کی درخواست کی۔ اس پر نجاشی نے قیصر سے مدد طلب کی اور بہت بھاری مسلح فوج دے کر یمن پر حملہ آور ہوا۔ ذونواس کو عبرتناک شکست ہوئی اور اب یمن پر باقاعدہ عیسائی حکومت قائم ہو گئی۔ لیکن ان عیسائی حکمرانوں میں سے ابرہہ نامی ایک حکمراں نے آنحضرت صلعم کی ولادت سے کچھ ہی دن پہلے کعبۃ اللہ کو منہدم کرنے کی غرض سے مکہ پر چڑھائی کی تھی جس کا اجمالی ذکر قرآن حکیم میں بھی موجود ہے۔

عیسائی حکومتوں میں یہودیوں پر جو مظالم ڈھائے جاتے تھے ان کے تصور ہی سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ خود پیروان مسیح کئی فرقوں میں بٹے ہوئے تھے اور ہر فرقہ اتنا متعصب اور تنگ نظر تھا کہ دوسرے فرقوں کی جان اور مال اس کے دست تعدی سے محفوظ نہ رہے تھے یہاں تک کہ برسر اقتدار طبقہ نے دوسرے فرقوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا چنانچہ گبن لکھتا ہے جب حکمران طبقہ سے مسلمانوں کی جنگ شروع ہوئی تو دوسرے فرقوں کے عیسائیوں نے باہر سے آنے والے اجنبی مسلمانوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور جی کھول کر اپنے ہم مذہبوں کے خلاف مسلمانوں کو مدد دی اور مسلمانوں کے ماتحت رہنا ان کو دوسرے عیسائی فرقوں کے ماتحت رہنے سے اچھا معلوم ہوتا تھا[2]۔

آنحضرت کی بعثت کے وقت چین اور ہندوستان جو ایشیائی ممالک میں اپنی قدیم تہذیب اور تاریخی عظمت کے اعتبار سے ممتاز سمجھے جاتے تھے، ایک عبوری دور سے گذر رہے تھے اور نہایت

---

[1] طبری ص ۹۲۵۔ [2] تاریخ زوال وانحطاط۔ روما۔

خطرناک قسم کی خانہ جنگیوں میں مبتلا تھے۔ ہند کے برہمنوں اور بدھ ازم کے علمبرداروں میں ایک مدت سے کشمکش چل رہی تھی اور بالآخر برہمنیت کے جبر وتشدد نے بدھ ازم کو ملک بدر کر دیا تھا اور آخر الذکر نے چین میں جا پناہ لی تھی۔ لیکن چین میں پہلے سے فتنوں کی بھرمار تھی اور بڑی مشکل سے اس کو وہاں قدم جمانے کی اجازت ملی۔

یہ تو دوسری اقوام کے حالات تھے لیکن خود عرب قوم جس میں آنحضرت صلعم پیدا ہوئے اجتماعی اور سیاسی اعتبار سے اس کی حالت بھی کچھ کم تشویشناک نہ تھی۔ یہ ایسی خودسر قوم تھی کہ اس میں قومی مرکزیت کا کبھی احساس ہی نہیں پیدا ہوا تھا اور اس وجہ سے یہاں کوئی متحدہ عرب اسٹیٹ قائم نہ ہوسکا تھا۔ اس ملک میں بیسیوں قبائل آباد تھے اور ہر قبیلہ آزاد و خود مختار تھا۔ بڑے بڑے شہروں میں اعیانیت کے طرز کی شہری مملکتیں قائم تھیں۔ پڑوس کے حکمرانوں کی للچائی ہوئی نگاہیں گاہے گاہے اس آزاد خطۂ ارضی کی طرف اٹھتی رہیں اور شاہان روم و ایران کی طرف سے بارہا کوشش کی گئی کہ اس خودسر قوم کو ہتھیا لیا جائے۔ لیکن وہ اس میں کبھی کامیاب نہ ہوسکے تھے۔ چنانچہ عثمان بن الحویرث کو جب قیصر نے مکہ کی بادشاہت کی سند عطا کی اور اس نے واپس آکر مکہ میں اعیانِ قریش کے اجتماع میں قیصر کا پیغام سنایا تو اس بات کے باوجود کہ اہل مکہ کا معاشی مفاد اہلِ روم و شام سے وابستہ تھا، انہوں نے کھلے طور پر انکار کر دیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ اہلِ مکہ ہمیشہ سے آزاد و خود مختار رہے ہیں اور وہ ہرگز کسی کی آمریت کو پسند نہیں کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قیصر نے مکہ والوں کو شام کے تجارتی سفر سے روک دیا، مگر یہ انتقامی اقدام بھی اہل مکہ کو بیرونی طاقت کی غلامی پر مجبور نہ کرسکا۔ غرض عربوں میں ایک طرف اگر یہ خوبی تھی کہ وہ حریت نواز اور جمہوریت پسند تھے تو دوسری طرف مرکزیت کے فقدان نے ان میں انتہائی درجہ کی بہیمیت، خودسری اور قبائلی عصبیت پیدا کر دی تھی اور اس جاہلی عصبیت نے سرزمین عرب کو صدیوں تک قتل و غارت اور سفاکی و خون آشامی کی آماجگاہ بنائے رکھا۔ اس ملک میں انسانی جان کی قیمت مکھی اور مچھر کے برابر بھی نہ تھی۔

نیز آزادانہ بدوی زندگی نے عربوں میں کچھ اچھے جوہر بھی پیدا کر دیئے تھے۔ مثلاً ہمت، پامردی،

شجاعت و بسالت، عزتِ نفس، فیاضی کی قسم کی صفات ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئے تھے لیکن زندگی کا کوئی پاکیزہ تصور نہ ہونے کی وجہ سے ان کی یہ صفات اصلاح و تعمیر کی جگہ تخریب انسانیت کے لئے استعمال ہو رہی تھیں۔ ایک قبیلہ کے لوگ دوسرے قبیلہ والوں سے نہایت حقیر اور معمولی بات پر الجھ جاتے اور دونوں کی طرف سے سیکڑوں انسانی لاشیں فرشِ خاک پر ڈھیر ہو جاتیں چنانچہ بکر و تغلب کی مشہور لڑائی جو حرب بسوس کے نام سے متعارف ہے صرف اتنی سی بات پر چھڑ گئی تھی کہ بسوس نامی عورت کی اونٹنی دوسرے فریق کی چراگاہ میں داخل ہوئی اور اس نے پناہ دیتے ہوئے پرندوں کے انڈے توڑ دیئے، اس پر کلیب وائل نے اونٹنی کو ہلاک کر دیا اور اس کے نتیجہ میں بکر اور تغلب کی جنگ چھڑ گئی جو چالیس سال تک جاری رہی۔

قبیلوی عصبیت نے ان کو خیر و شر اور نیک و بد کے احساس و شعور سے بالکل بے نیاز کر دیا تھا۔ قتل و غارتگری، ظلم و معصیت، فحش کاری اور دیگر جرائم ان کی نگاہ میں عیب نہ تھے بلکہ قابلِ فخر کارنامے تصور کئے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک شاعر اپنی نسبت لکھتا ہے

وانی لا ازال اخا حروب اذا لم اجن کنت مجن جان

آنحضرت صلعم کے ایام جوانی میں قریش اور قبیلہ قیس کے درمیان بڑے عرصہ تک جنگ جاری رہی جو حرب فجار کے نام سے مشہور ہے اس جنگ نے دونوں طرف سے کئی خاندان برباد کر دیئے تھے۔ مدینہ کے قبائل اوس اور خزرج ہمیشہ باہم جنگ آزما رہتے تھے اور زمانہ بعثت سے کچھ ہی عرصہ پہلے بعاث کی لڑائی سے فارغ ہوئے تھے۔

غرض عرب کی داخلی سیاست کی اصلاح کا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہ تھا جو کسی سیاسی رہنما کی ذہنی اُپج سے حل ہو جاتا، اور اس پر مستزاد یہ کہ عرب کا محل وقوع بھی ایسا تھا کہ وہ ہر طرف سے اس وقت کی بڑی طاقتوں میں گھرا ہوا تھا۔ اور ان متمدن طاقتوں کے سیاسی اور معاشی دباؤ سے عرب بڑی حد تک متاثر تھے۔ اس کی تفصیل کے لئے عرب کے تاریخی پس منظر کو سامنے لانا ضروری ہے عرب کسی زمانہ میں ایشیا و یورپ کے ممالک کے لئے تجارتی گذرگاہ کی حیثیت رکھتا تھا اور خود عربوں کی

زیست کا ذریعہ بھی بیرونی تجارت ہی تھی۔ عرب ہمیشہ سے تجارت کی غرض سے بیرونی ممالک مصروشام، مشرقی افریقہ، عراق وفلسطین اور ہند وچین کا سفر کرتے تھے بلکہ عرب کی قدیم تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مردم خیز خطۂ ارضی اپنے باشندوں کو آب ودانہ کے لئے ہمیشہ باہر دھکیلتا رہا ہے۔ اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ عرب کی سرزمین کا بڑا حصہ پیداوار کی کمی کی وجہ سے خود مکتفی نہ تھا اور ان لوگوں کو طوعًا وکرہًا معاشی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے اپنی بے آب وگیاہ مرز بوم کو چھوڑ کر سرسبز وشاداب ممالک کا رُخ کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ عرب کی قدیم ترین تاریخ گواہ ہے کہ حضرت مسیحؑ سے دو تین ہزار سال قبل عرب کی کچھ قومیں صحرائے عرب سے نکل کھڑی ہوئیں اور انسانی آبادیوں کو پامال کرتی ہوئی آندھی کی طرح آناً فاناً دنیا کے بہت بڑے حصہ پر چھا گئیں۔ ان قوموں نے بیشتر ممالک مثلاً مصروشام، مشرقی افریقہ، ایران وعراق، قرطاجنہ، کریٹ اور یونان کو زیرنگیں کیا اور بڑی بڑی مملکتیں قائم کیں۔ چنانچہ ابن خلدون نے لکھا ہے:۔

وکان لھذہ الامم ملوك ودول فی جزیرۃ العرب وامتد ملکھم فیھا الی شام ومصر فی شعوب منھم (تاریخ ابن خلدون جلد ۲)

ان اقوام میں کئی بادشاہ ہوگزرے ہیں۔ جزیرۂ عرب میں ان کی بڑی بڑی سلطنتیں قائم تھیں اور ان کے کچھ قبائل کی وسعتِ مملکت مصروشام تک پہنچ گئی تھی۔

یہ قومیں وہی ہیں جن کو قرآن حکیم نے عادِ اُولیٰ کے نام سے موسوم کیا ہے اور قدیم عربی تاریخ میں عرب عاربہ (خالص عرب) اور عرب بائدہ (ناپید ہونے والے عرب) کے ناموں سے متعارف ہیں۔ اور اُمم سامیۂ اُولیٰ میں سے جو لوگ عرب ہی میں رہ گئے تھے انہوں نے عرب کے شمال میں عظیم مملکت قائم کی تھی۔ قرآن حکیم نے ان کو "ثمود" کا نام دیا ہے۔

زمانہ کی نیرنگیوں نے قوموں کو ایک ہی حال میں کب رہنے دیا ہے؟ شاید یہ بات منشاءِ خداوندی کے خلاف ہے کہ ایک ہی قوم ہمیشہ کے لئے انسانی دنیا پر مسلط رہے، اس لئے اس قوم کا اقتدار بھی آخر کچھ حامی النسل قوموں کے ہاتھوں ختم ہوا۔

یقال انھم انتقلوا الی جزیرۃ العرب من بابل لما زاحمھم فیھا بنو حام۔ (کتاب العبر جلد ۱)

کہا جاتا ہے کہ وہ بابل سے جزیرۂ عرب کی طرف منتقل ہو گئے جبکہ حامی النسل لوگوں نے ان کو مار بھگایا۔

اسی طرح مصر میں قبطی اقوام نے نئی حکومت قائم کر لی اور دوسرے ممالک میں بھی ان کا شاہانہ اقتدار مٹ گیا۔ ان کے بعد عراق و یمن و شام میں مختلف قومیں برسر عروج رہیں۔ یہاں تک کہ رومی عیسائی سلطنت نے مصر، شام اور فلسطین پر تسلط قائم کر لیا۔ اور عراق و یمن اہل فارس کے زیر نگیں آ گئے۔ لیکن چونکہ ایران و روم میں مسلسل آویزش رہتی تھی اور اس کے علاوہ عرب کے خانہ بدوش بدوی قبائل عراق اور شام میں داخل ہو کر لوٹ مار کرتے تھے اس لئے ایرانی حکومت نے مصلحت اندیشی کے طور پر عراق میں عرب اسٹیٹ قائم کر دیا اور رومانے دمشق میں عربوں کی ایک ریاست قائم کر دی۔ یہ ریاستیں جن سیاسی اغراض کے لئے قائم ہوئی تھیں ان کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوئیں اور نہ صرف یہ کہ ان سرحدی ریاستوں نے حاجز مملکت (بفر اسٹیٹ) کا کام دیا اور ایرانی و بیزنطینی عرب بدوؤں کے غارت گرانہ حملوں سے محفوظ ہو گئے بلکہ ایران و روم کی جنگوں میں ان ریاستوں کے لوگ اپنے اپنے اقتدار اعلیٰ کے ماتحت سر دھڑ کی بازی لگا دیتے اور میدان جنگ میں پیش پیش رہتے تھے۔ بالآخر بیزنطینیوں کا اثر و نفوذ یہاں تک بڑھا کہ شمالی عرب کے بہت سے قبائل مثلاً دومۃ الجندل، اذرح، جربا وغیرہ نے عیسائیت قبول کر لی۔ اور بیزنطینی حکومت نے یہاں بھی کچھ عرب سرداروں کی ریاستیں قائم کر دیں اور اس طرح اس نے اپنے آپ کو محفوظ بنا لیا تھا۔ اسی طرح عراق اور یمن پر ایرانی تسلط بھی دعوت نبوی کے لئے مستقل خطرہ تھا۔

غرض عرب کی خارجی سیاست کچھ اس قدر پیچیدہ تھی کہ محض سیاسی بصیرت اور عقل و تدبیر سے اس کو حل نہ کیا جا سکتا تھا بلکہ اس کے لئے پیغمبرانہ بصیرت اور الہامی طریق کار کی ضرورت تھی۔ مذکورہ مسائل کے علاوہ عرب اور بیرون عرب کا معاشی مسئلہ بھی کچھ کم اہمیت نہ رکھتا تھا اور یہ بات بادنیٰ تامل سمجھ میں آ سکتی ہے کہ جو ملک سیاسی لحاظ سے شدید انتشار و ابتری کا شکار ہو یا پے بہ پے جنگوں نے اس کے ملکی نظام کو درہم برہم کر دیا ہو وہاں معاشی خوشحالی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور پھر آمرانہ طرز حکومت میں دولت کی نامساویانہ تقسیم ایک ناگزیر اور طبعی چیز ہے اور ظاہر ہے کہ اس وقت تمام دنیا کی قومیں مطلق العنان حکمرانوں یا قبائلی سرداروں کے پنجۂ استبداد میں جکڑی ہوئی تھیں۔

یہ باتیں تو تمام ممالک میں مشترک تھیں لیکن عرب کا معاشی مسئلہ دوسرے ممالک کی نسبت سے

بہت زیادہ اُلجھا ہوا تھا بلکہ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے ملک کے پیداواری ذرائع کے فقدان نے عربوں کو ہمیشہ پریشان حال رکھا۔ اس ملک کی پیداوار کھجور تھی۔ بعض علاقوں میں غلہ کی کاشت ہوتی تھی لیکن وہ اتنی نہ تھی کہ دوسرے علاقوں کے لئے برآمد کی جاسکے، نیز بکریوں اور اونٹنیوں کا دودھ بھی صحرائی لوگوں کی غذا کے کام آتا تھا۔ زیادہ تر یہ لوگ لوٹ مار اور غارت گری کے ذریعہ تو تشکم کے لئے ایندھن مہیا کرتے تھے۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ اگر ان کو چولھے کے لیے پتھر کی ضرورت ہوتی تو کسی مکان کی دیوار توڑ دیتے اور اگر لکڑی کی ضرورت پڑتی تو کسی مکان کی چھت اکھاڑ لیتے۔ لوٹ مار اور قتل و غارت گری اخلاقی نقطۂ نظر سے خواہ کتنی ہی معیوب کیوں نہ ہو لیکن ان کی نظر میں معیوب نہ تھی بلکہ ان کو اپنے اس ظالمانہ کردار پہ ناز تھا، اور اس کے علاوہ کچھ لوگوں کا ذریعہ معاش بیرونی ممالک کی تجارت تھی۔

نیز ملک کے طول و عرض میں یہودی سرمایہ دار پھیلے ہوئے تھے، تجارت کی اہم منڈیوں پر ان کا قبضہ تھا اور اس کے علاوہ یہ لوگ وسیع پیمانہ پر سودی کاروبار بھی کرتے تھے، عرب عوام ان کے قرضوں کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے اور یہودی بنئے نہایت گراں شرح سود پر قرضے دیتے تھے۔ ان درندہ صفت انسانوں کی سنگدلی کا یہ حال تھا کہ ضمانت کے طور پر لوگوں کے بچوں اور عورتوں کو گروی رکھتے تھے۔

اس اجمالی بیان سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس ملک کے عوام کی معاشی زندگی حد درجہ پست تھی اور قوم کو اس خوفناک افلاس و فاقہ مستی سے نکالنا ملک کا اہم اجتماعی و ملی سوال تھا۔

عربوں کے معاشرتی رسم و رواج اور اخلاقی و مجلسی مفاسد اس درجہ گہرے اور خطرناک تھے کہ عام حالات میں ان کی اصلاح کی کوئی توقع نہ ہوسکتی تھی۔ بلند و پست، اونچ نیچ اور شریف و وضیع کا امتیاز ان کی قومی روایات میں غیر معمولی اہمیت رکھتا تھا اور اخلاقی و مجلسی مفاسد کی تو کوئی حد ہی نہ تھی یہ مسئلہ ایک مستقل موضوع بحث ہے اور اس کے تفصیلی گوشوں سے بحث کرنا اس موقع پر مشکل ہے یہاں صرف ایک واقعہ کی طرف اشارہ کرنا کافی ہوگا۔

طائف کی سفارت نے جب آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف باریابی حاصل کیا تو انہوں نے کہا ہم اس شرط پر اسلام قبول کرتے ہیں کہ ہمارے یہ مطالبات تسلیم کئے جائیں پہلے یہ کہ زنا

ہمارے لئے جائز رکھی جائے کیونکہ ہم میں اکثر لوگ مجرد زندگی بسر کرتے ہیں اور زنا کے بغیر ان کو چارہ نہیں۔ دوسرے شراب سے منع نہ کیا جائے کیونکہ یہ ہماری قومی تجارت ہے۔ تیسرے سودی کاروبار کی مخالفت سے ہمیں مستثنیٰ کیا جائے۔ کیونکہ یہ ہمارا ذریعۂ معاش ہے۔ آنحضرت صلعم نے یہ تمام شرطیں نامنظور کیں۔ لیکن اس واقعہ سے اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی مجلسی زندگی کس قدر بے لگام اور معصیت آلود تھی۔

عرب کے علاوہ دوسرے ممالک کا بھی یہی حال تھا۔ مثال کے طور پر ہندوستان ہی کو لیجئے۔ یہاں ذات پات کی تفریق اور نامنصفانہ مجلسی قوانین نے آبادی کو کئی طبقوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ کسی اونچی ذات کا مرد اگر کسی نیچی ذات کی عورت سے زنا کرتا تو اس کے لئے کوئی سزا نہ تھی لیکن کسی اعلیٰ ذات کو اچھوت نسل کا آدمی چھو لیتا تو اس کی سزا موت تھی۔ اس ملک کی اخلاقی پستی کا یہ عالم تھا کہ عورتیں جوئے میں ہاری جاتی تھیں۔ ایک عورت کے کئی کئی شوہر ہوتے تھے۔ قومی تہواروں میں شراب کے دور چلتے تھے اور نشہ کی حالت میں ماں، بہن اور بیٹی کی تمیز نہ رہتی تھی اور اس پر طرفہ یہ کہ اس کام کو نیکی کا کام تصور کیا جاتا تھا۔

یہود کے اخلاقی اور مجلسی مفاسد کو قرآن حکیم نے بالوضاحت بیان کیا ہے۔

نتائج بحث و فکر گذشتہ بحث سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ رسول عربی صلعم کی بعثت کے وقت انسانی زندگی کے اجتماعی مفاسد کیا تھے؟ ان مفاسد پر دوبارہ سرسری نگاہ ڈالئے تاکہ آپ کو ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو سکے کہ عصر حاضر کے اجتماعی مفاسد کو اس دور کے مفاسد سے کیا نسبت ہے۔

(۱) بے مقصد اور بے روح مذہبیت: یعنی اس دور کی تمام قومیں اگرچہ کسی نہ کسی مذہب کی پیرو تھیں، لیکن اس کے باوجود ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی دین کی روح سے بالکل تہی مایہ تھی اور یہی وہ بنیادی فساد تھا جس نے ان لوگوں کی نگاہ سے زندگی کا حقیقی تصور بالکل اوجھل کر دیا تھا۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو دیگر تمام مفاسد کا سرچشمہ یہی ہے۔

(۲) شدید نسلی و قومی تعصب۔ اس دور میں سطح ارضی پر سینکڑوں چھوٹی بڑی قومیں آباد تھیں

اور ہر قوم اس زعم میں مبتلا تھی کہ عظمت و شرف اور فضیلت و منقبت کے تمام محاسن و کمالات صرف اسی کے لئے مخصوص ہیں اور دوسرے لوگ محض اس کی محکومی اور نازبرداری کے لئے پیدا ہوئے ہیں یعنی ہر قوم یہ عقیدہ رکھتی تھی کہ مخلوق خدا پر خدائی کرنے کا حق اسی کو حاصل ہے اور دوسری قوموں کا بس یہی کام ہے کہ اس کی بندگی کریں۔

(۳) بے قید سیاست یعنی اس دور میں زندگی کا اجتماعی اور سیاسی نظام دین کی پابندی سے بالکل آزاد تھا اور اس ثنویت نے قوموں کی اجتماعی زندگی میں مہلک جراثیم پیدا کر دیے تھے۔

(۴) دولت کی نامنصفانہ تقسیم

(۵) ظالمانہ معاشرتی اور مجلسی رسم و رواج۔

اس تفصیل سے آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ اس دور کے عملی مسائل کیا تھے اور اس بات کو سمجھنا بھی کچھ مشکل نہیں کہ دورِ حاضر کے عملی مسائل بنیادی حیثیت سے دورِ رسالت کے مسائل سے مختلف نہیں ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ چودہ سو سال پہلے کے انسانی دور اور موجودہ دور میں کچھ فرق نہیں ہے۔ یقیناً فرق ہے اور ہونا چاہئے۔ لیکن سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ صرف اتنا ہی ہے کہ انسانیت کے حقیقی اور بنیادی مسائل میں چودہ سو سال گذرنے کے بعد بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ یقیناً آج بھی پیروانِ مذاہب، مذہب کی حقیقی سپرٹ سے بالکل محروم ہیں، اور ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو دیکھ کر کسی کو یقین نہیں آسکتا کہ یہ کسی دین کے پیرو ہیں۔ اسی طرح اقوامِ حاضرہ کا نسلی اور قومی تعصب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ دین و سیاست کی جدائی ایک مستقل عقیدہ بن چکی ہے۔ معاشی نامساوات اور معاشرتی مفاسد بھی انسانی سوسائٹی میں گہرا اثر پیدا کر چکے ہیں۔ لہذا جب انسانیت کا مرض وہی ہے جو چودہ سو سال پہلے تھا تو علاج بھی وہی کیوں نہ ہو جو پہلے ایک مرتبہ آزمایا جا چکا ہے۔ یعنی آج اگر ہم دیانت داری سے ان مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے ایک تابناک مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔